© rasailojaraid.com

تاثرات

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اُردو کے قادر الکلام شاعر، انگریزی کے زبردست ادیب، نڈر صحافی، آتش بیان مقرر، ماہر سیاست دان، پاک و ہند کی کامل آزادی کے مخلص علم بردار اور مسلمانوں کے محبوب ترین رہنما تھے۔ ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ انڈین سول سروس کی تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ واپس آکر کچھ عرصہ رام پور اور بڑودہ میں ملازمت کی۔ پھر ملازمت سے استعفیٰ دے کر ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتے سے کامریڈ جاری کیا مگر جلد ہی اُسے دہلی لے آئے۔ اس میں انگریزی انشاپردازی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ ایچ۔ جی ویلز جیسا انگریز ادیب یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

"محمد علی نے برک کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔"

دراصل ان کا دماغ مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔ وہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں مسلمانوں کی مظلومی پر تڑپ اٹھے۔ ترکوں سے ہمدردی کی پاداش میں چھندوارہ میں نظر بند کر دیے گئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں کانگرس کا ساتھ دیا۔ گاندھی جی کو خوب اچھالا۔ پھر ہندوؤں کی تنگ نظری کی بنا پر کانگرس سے الگ ہو کر کامل آزادی کا مطالبہ کیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر مشرق کی حمایت میں مغرب سے مغرب ہی کے ہتھیاروں سے لڑے۔ آخر ۱۴ر شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ترپن برس کی عمر پا کر لندن میں انتقال کیا اور بیت المقدس میں دفن ہوئے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک آفتاب تھے جو مشرق سے طلوع ہوا، مغرب میں غروب ہوا اور اب مشرق و مغرب کے مرکز بیت المقدس میں آرام فرما ہے۔

مولانا نے اپنی مسافرانہ موت کی پیشین گوئی خود ہی کر دی تھی:

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور

بقول سید سلیمان ندوی — "ان کی رحلت کے ساتھ ہی وہ پُردرد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی تھی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو ہو جاتا تھا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسروں کو بھی بے تاب کرتا تھا قیامت تک کے لیے ساکن ہوگیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بہاتی تھیں، ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ وہ پُر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور تبرد آزمائی میں مصروف تھے ایسے تھکے کہ پھر نہ اُٹھے۔

مولانا محمد علی ملّت کے عزادار تھے۔ اب ساری ملّت ان کی عزادار ہے۔ وہ اُمّتِ محمدیہ کے سوگوار تھے، اب کئی برس سے پوری امتِ محمدیہ ان کا سوگ منا رہی ہے۔ انھوں نے اسلام کا ماتم کیا تھا، اب دنیائے اسلام ان کا ماتم کر رہی ہے۔ وہ پاک و ہند کے ماتم دار، طرابلس کے سوگوار، عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کے لیے سوختہ غم اور بیت المقدس کے لیے وقفِ الم تھے۔ ان کا حق سرزمینِ اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ ان کے لیے اوّلین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ گیا اور وہ اس میں سما گئے۔"

اقبالؔ نے کیا خوب کہا تھا:

خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنا در گرفت ۔۔۔ سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست ۔۔۔ گرچہ آں نورِ نگاہِ خاوراز خاور گزشت

مولانا محمد علی جوہرؔ کے کارناموں میں ان کی غزل سرائی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی لیکن جس طرح ان کی آخری پیش گوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ غلام ہندوستان میں واپس نہیں آئے، ان کے مرنے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے زندان خانہ میں بیٹھ کر جن واردات کو نظم کیا تھا وہ سرتاسر صداقت تھے اور پیش گوئیوں کی عجیب و غریب مثالیں۔ انھوں نے کہا تھا:

اکسیر یہی ایک دعا میرے لیے ہے ۔۔۔ اللہ ہی کے رستے میں جو موت آئے تو اچھا

ان کی یہ پُر تاثیر دعا اکسیر بنی اور ان کے حق میں قبول ہوئی۔ ان کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا، مشرق و مغرب میں ہوا، پاک و ہند میں ہوا، مصر و شام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت المقدس میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لیے ہوا ہو۔ صاحبِ دل شاعر کی صداقت سے کس کو انکار ہے:

ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے

مولانا کی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ وہ نہایت زندہ دل، یار باش اور بے تکلف انسان تھے۔ ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طالب علمی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں ایک اجتماع ہوا جس میں طے پایا کہ سب ملکوں کے طالب علم اپنے اپنے قومی ترانے سنائیں۔ ہندوستان کی نمائندگی مولانا محمد علی کے حصے میں آئی۔ اقبال کا قومی ترانہ اس وقت تک رائج نہ ہوا تھا۔ اگر انگریزی ترانہ GOD SAVE THE KING (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) سنایا جاتا تو بڑی ہیٹی ہوتی۔ آخر ان کو اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ایک دلچسپ ترکیب سوجھ گئی۔ جب ان کی باری آئی تو انھوں نے اسٹیج پر پہنچ کر ترنم سے مصرع اُٹھایا:

بی بی مینڈکی ری

تو تو پانی کی ہے رانی

بی بی مینڈکی ری . . . . .

مولانا نے تالی کی تھاپ اور پاؤں کی ٹاپ سے یہ قومی ترانہ اس انداز سے گایا کہ دوسرے طالب علموں پر وجد طاری ہوگیا اور وہ بھی جھوم جھوم کر مصرع اٹھانے لگے۔

لطف یہ ہے کہ اس مقابلے میں ہندوستان کا یہی ترانہ اوّل نمبر پر آیا۔

آکسفورڈ ہی کی تعلیم کے دوران تعطیلات کا زمانہ آیا۔ اکثر طلبہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بعض نے سیرو تفریح کی غرض سے یورپ کی مختلف سیرگاہوں کا رُخ کیا۔ مولانا کو ان دنوں مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے بھی رختِ سفر باندھا اور آکسفورڈ کے نواحی ندی نالے کھنگال ڈالے۔

ایک روز ندی کنارے سارا دن بیٹھے رہے لیکن کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی، دن ڈھلنے لگا تو اُٹھے۔ ندی کے پاس ہی ایک پرانی وضع کی عمارت تھی جس کے در و دیوار پر وحشت اور اُداسی برس رہی تھی۔ سلاخوں والے دریچوں سے معلوم ہوتا تھا کہ جیل یا پاگل خانہ ہے۔ اتنے میں دریچہ کھلا اور ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے مولانا کو اشارے سے بلایا اور پوچھا:

تم کون ہو؟

میں طالب علم ہوں اور آکسفورڈ میں پڑھتا ہوں!

یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

مچھلیاں پکڑنے!

کوئی مچھلی ہاتھ آئی؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک بھی نہیں!
تو پھر یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو، اندر آؤ۔
مولانا کہا کرتے تھے کہ اس پاگل کا یہ فقرہ مجھے ساری عمر یاد رہا۔

دلّی کے ایک شہزادے کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ روغنی تصاویر بناتے تھے۔ غالباً یہی بے چارے کی معاش کا ذریعہ تھا۔ انھوں نے مولانا کو دلّی کی جامع مسجد کی تصویر پیش کی۔ تصویر بہت اچھی تھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چونکہ گداگروں کی موجودگی ایک لازمی بات ہے اس لیے مصوّر نے بھی نقل کو اصل دکھانے کی غرض سے ایک سیڑھی پر ایک عورت دکھائی تھی جو پھٹا پرانا برقع اوڑھے اور ننگے بچوں کو ساتھ لیے کھڑی تھی۔ عورت کا ہاتھ بھیک کے لیے برقع سے باہر نکلا ہوا تھا اور تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ " بھکارن "۔ مولانا نے تصویر دیکھ کر کہا۔ بھائی مجھے آرٹ کے سلسلے میں زیادہ شُدبُد تو نہیں مگر میں یہ تصویر لینے اور ہدیہ دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ میری بات مانو اور اس کا نام بھکارن مٹا کر جو فقرہ میں عرض کروں وہ درج فرما دو۔ مصوّر کو نام پر ہی تو ناز تھا اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ بھلا کیا درج کر دوں؟ مولانا نے پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ دیا:

"HER FATHER BUILT IT" (اس عمارت کو اس کے اجداد نے بنایا تھا)

شہزادہ صاحب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اب وہ جامع مسجد کی معمولی تصویر نہ تھی بلکہ آلِ تیمور کا مرقع عبرت تھی۔ مولانا محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اسے دیکھتا تھا دو گرم آنسو یا ایک ٹھنڈی سانس اسے بطور خراج ادا کیے بغیر نہ رہتا تھا۔

ہمدرد کے آخری دَور میں مولانا کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ ہوشنگ آباد کے عبدالسمیع خاں اس سلسلے میں ان سے ملنے کے لیے آئے۔ مولانا نے پوچھا:
آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟
سمیع صاحب نے کہا میں سی پی (صوبجات متوسط) کا رہنے والا ہوں۔
مولانا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
کیا سی پی میں آرٹسٹ بھی ہوتے ہیں؟
سمیع صاحب نے فوراً جواب دیا۔
آرٹسٹوں کو چھوڑیے۔ سیپی میں موتی ہوتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا اس حاضر جوابی پر پھڑک اُٹھے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انھیں فوراً ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد جب کبھی بڑوں" سے ان کا تعارف کراتے تو کہتے۔ یہ سی پی کے موتی ہیں۔

ایک دفعہ مولانا سیتاپور میں گاندھی جی کے ساتھ بیٹھے شریفے کھا رہے تھے۔ گاندھی جی نے کہا۔

مولانا آپ کو ذیابیطس کی شکایت ہے۔ شکر آتی ہے۔ آپ شریفے نہ کھائیے۔

مولانا نے کہا۔

واہ کیوں نہ کھاؤں۔ سسرال کا مال بھی نہ کھاؤں؟

سسرال کا لفظ سن کر گاندھی جی چونکے تو مولانا نے وضاحت کی کہ حیران نہ ہوجیے میں رام پور کا رہنے والا ہوں اور شریفے سیتاپور کے ہیں۔ رام اور سیتا کے رشتے پر غور کیجیے تو یہ شریفے سسرال کے ہوئے یا نہیں۔

کانگرس نے جب نمک بنانے کی تحریک شروع کی تو گاندھی جی نے مولانا محمد علی کو بھی نمک بنانے اور سول نافرمانی کی دعوت دی۔ مولانا نے اپنی بیماری (ذیابیطس) کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"میں بھلا نمک کیا بناؤں گا۔ قوم کے غم میں دس سال سے شکر جو بنا رہا ہوں"

نان کوآپریشن یعنی عدم تعاون کی تحریک کی باگ ڈھیلی ہوتے ہی ہندوستان کی سیاست میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک طبقہ اپنا اصول بدل کر اسمبلیوں میں جانے اور وہاں اپنی تخریبی مہم جاری رکھنے کا حامی ہوگیا۔ یہ لوگ ماڈریٹ کہلاتے تھے۔ مولانا محمد علی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی نمائندے اسمبلیوں میں جائیں اور تضیع اوقات کریں۔ اس لیے انھیں نو چینجر "NO CHANGER" کہتے تھے۔

انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ مولانا محمد علی اسمبلی کا تماشا دیکھنے کے لیے پریس گیلری میں جاکر بیٹھ گئے۔ پنڈت شیام لال نہرو نے انھیں دیکھا تو کہا:

مسٹر محمد علی! جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو پھر نیچے بھی آجایے۔

مولانا نے برجستہ جواب دیا

"I STILL LOOK DOWN UPON YOU" (میں تو اب بھی اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھ رہا ہوں)۔

ایک دفعہ دہلی میں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولانا عربی لباس یعنی جبّہ پہنے تشریف لائے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے مذاقاً کہا۔

"اوہو آپ ہیں مولانا! میں سمجھا تھا شاید بیگم بھوپال تشریف لا رہی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا نے فوراً جواب دیا :

" ہاں - واقعی - اس زنانہ اسمبلی میں مردوں کا کیا کام ؟ "

روزنامہ زمیندار اور ہمدرد کی قلمی جنگ جاری تھی - مولانا ظفر علی خاں زمیندار میں مولانا محمد علی جوہر کے خلاف اور مولانا محمد علی ان کے خلاف ہمدرد میں لکھ رہے تھے - انہی دنوں خلافت کمیٹی کا کوئی اجلاس ہوا، جس میں دونوں شریک تھے - مولانا ظفر علی خاں کسی تجویز سے ناراض ہو کر واک آؤٹ کر گئے - مولانا کے صاحبزادے اختر علی خاں اور زمیندار کے معاون ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہر نے بھی ان کا ساتھ دیا - مولانا محمد علی ان دنوں بیمار تھے اور لیٹے لیٹے اجلاس کی کاروائی میں حصہ لے رہے تھے، وہ جھٹ اٹھ بیٹھے اور بے ساختہ بولے

" غضب ہو گیا - باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں خفا ہو گئے "

۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) کے اجلاس میں تشریف لے گئے - جلسہ مدرسے کے وسیع میدان میں تھا - مولانا نے دھنواں دھار تقریر کی - تقریر کے خاتمے پر مجمع کے ایک گوشے سے ایک بوڑھا دیہاتی اٹھا اور مجمع کو چیرتا ہوا سیدھا اسٹیج کی طرف بڑھا - اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اُسے سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنی دھن کا پکا تھا - اس نے مولانا کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا اور مولانا کی داڑھی چوم کر کہا :

" واللہ محمد علی! جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا - "

یہ کہہ کر وہ مڑا تو مولانا نے فرمایا :

" قبلہ! اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی "

۱۹۲۱ء ہی کی بات ہے - رفاہِ عام لکھنؤ کے جلسہ میں مولانا کی تقریر تھی - ڈائس پر مولانا شوکت علی اور دیگر بہت سے رہنما بیٹھے تھے - نعروں اور تالیوں کی گونج میں مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوتے اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا - جب وہ برطانوی سیاست کے تار پود بکھیرنے پر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ :

" جنگل کا شیر گونج رہا ہے، چھاڑ رہا ہے "

جب تقریر نقطۂ عروج پر پہنچی تو ایک گوشے سے کسی نے کہا " آواز نہیں آ رہی " مولانا نے گرج کر کہا :

" جن لوگوں تک میری آواز نہیں پہنچ رہی، ان کے کانوں پر برطانوی سامراج کی مہریں لگی ہوئی ہیں - وہ میری تقریر کبھی نہیں سن سکیں گے - لہٰذا خاموش رہیں "

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس پر پورا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

۶
شملہ کی ایک دعوت میں مولانا خلافتی لباس میں رونق افروز تھے۔ اردو میں باتیں کرتے کرتے کسی بات پر الجھ کر انگریزی بولنے لگے۔ اب بھلا کون ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت کرسکتا تھا۔ ایک ہندو رانی نے مولانا کو اس قدر روانی سے انگریزی بولتے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا "اتنی اچھی انگریزی آپ نے کہاں سیکھی؟" مولانا نے جواب دیا۔ "ایک چھوٹے سے قصبے میں" یہ سن کر رانی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "کون سے قصبے میں؟"

"آکسفورڈ" مولانا نے جواب دیا اور ساری محفل زعفران زار بن گئی۔

۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا، سائمن کمیشن ہندوستان آیا ہوا تھا۔ ملک بھر میں اس کی مخالفت ہو رہی تھی لیکن مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے تعاون کو تیار تھا جس کے خلاف ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ مولانا محمد علی کو اس میں تقریر کرنا تھی۔ خبر گرم تھی کہ کچھ لوگ اس جلسے میں گڑبڑ مچائیں گے اور مولانا حسرت موہانی ان کی پشت پناہی کریں گے۔ مولانا محمد علی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ چند ہی جملے بولنے کے بعد وہ حسرت صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا:

"حسرت صاحب! آپ کمیشن کے ساتھ موافقت کے حق میں ہیں یا مخالفت کے؟"

"جی میں! نہ ہیں موافق ہوں نہ مخالف!"

مولانا محمد علی نے کہا۔

"اچھا تو یہ کہیے کہ آپ نہ کوآپریشن چاہتے ہیں نہ نان کوآپریشن بلکہ صرف آپریشن چاہتے ہیں۔"

جلسہ اس پر خوب ہنسا اور ہڑبونگ کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ پھر کسی کو گڑبڑ مچانے کی جرأت نہ ہوئی۔

مولوی ظفر الملک علوی مدیر الناظر لکھنؤ ایک جلسے میں سبز عمامہ اور سبز لبادہ اوڑھے ہوئے پہنچے۔ مولانا محمد علی بھی شریک تھے۔ انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا:

"یہ ہریل کہاں سے آگیا؟"

یہ تھے مولانا محمد علی جوہر مرحوم، جن کی ولادت کو اب سو سال پورے ہوتے ہیں۔ آج سے نصف صدی پیشتر تک وہ ہر بزم میں بلبل خوشنوا بن کر چہکتے تھے، اب ہمارے کان ان کے ترانے سننے کو ترس رہے ہیں مگر وہ کبھی نہیں گونجیں گے۔ ان کی آتشیں زبان ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی مگر اب اس کی تابش کسی معرکے میں نظر نہیں آئے گی۔

محمد عبداللہ قریشی

© rasailojaraid.com